(علامہ محمد اسد)

ڈائریکٹر، اسلامک ری کنسٹرکشن
حکومت مغربی پنجاب
لاہور، ۱۸اگست، ۱۹۴۸ء

یادداشت بخدمت مرکزی حکومت

پاکستان میں نفاذ شریعت، اگست ۱۹۴۸ء

(پاکستان میں اسلامی تشکیل کے حوالے سے اہم دستاویزات)

یہ یادداشت علامہ محمد اسد نے محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ۱۸/ اگست ۱۹۴۸ء کو انگریزی زبان میں (MEMORANDUM: ENFORCEMENT OF SHARIAH IN PAKISTAN, 18th August, 1948) کے عنوان سے مرکزی حکومت کو بھیجی[1]۔ یادداشت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(یادداشت: پاکستان میں نفاذِ شریعت)[2]

یادداشت کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

میں سمجھتا ہوں کہ محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ، مغربی پنجاب کی سرگرمیوں سے مرکزی حکومت کو کچھ تشویش لاحق ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے ان تحفظات کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اس وقت بعض حلقوں میں پاکستان میں نظامِ شریعت کے قیام کا دعویٰ کر کے ملک کو ایک رجعت پسندانہ رُخ دینے اور ملکی حکمت عملی کو تنگ اور جامد ذہنیت کے ساتھ اسلام کی عکاسی کرنے کی طرف موڑنے کا رجحان پایا جاتا ہے، جو کہ ان صدیوں کا ایک کردار ہے جن میں ہم زوال کا شکار تھے۔بلکہ در حقیقت، وہی ہمارے تنزل کا سبب تھا؛ اور چوں کہ محکمۂ اِحیائے ملت اسلامیہ کا قیام نظریۂ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے مقصد سے عمل میں آیا ہے، تو خدشہ ہے کہ اس کی سرگرمیاں ان رجعت پسندانہ رجحانات کو تقویت پہنچائیں گی اور اس طرح حکومت کے ان اقدامات کو نقصان پہنچائیں گی جن کے ذریعے حکومت، پاکستان کو ایک روشن خیال اور ترقی پسند ریاست بنانا چاہتی ہے۔

علامہ محمد اسدؒ ادارہ برائے اسلامی تعمیرِ نو (مغربی پنجاب) پاکستان کے سٹاف کے ساتھ

میں شروع ہی سے یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ، جو حکومت مغربی پنجاب کی طرف سے میری ذمہ داری میں دیا گیا ہے، اس کا قیام ہمارے اس ملک میں زندگی کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے اور قرآنِ مجید کے پیغام میں مندرج نظریے کا احساس بیدار کرنے میں مدد دینے کے لیے ہی عمل میں لایا گیا ہے۔ مگر، اس کے ساتھ ساتھ، میں زور دے کر اس حقیقت کو بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا تصور، جس کی ہم وکالت کر رہے ہیں، وہ نہیں ہے جو اندھیرے زمانوں سے نسبت رکھنے والے لوگ پیش کرتے ہیں، اور مسلم عوام کے درمیان زیادہ اونچی آواز بھی وہی لوگ لگا رہے ہیں، اور یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام کے اصل محافظ وہی ہیں۔ حقیقتاً ہمارا ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن / محکمہ احیائے ملت اسلامیہ ہی اسی لیے قائم کیا گیا تھا کہ ایسے ظلماتی تصورات کے

1 یہ یادداشت علامہ محمد اسدؒ نے محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مرکزی حکومت کو بھیجی۔

2 چوہدری مظفر حسین کے پیش لفظ کے ساتھ بزم اقبال کے سہ ماہی مجلہ "اقبال"، جلد ۴۵، شمارہ ۳، جولائی ۱۹۹۸ء نے صفحات ۱ تا ۲۲ میں دوبارہ شائع کیا۔

مقابلے میں کام کیا جائے اور اسلامی قانون اس طرح پیش کیا جائے کہ ایک روشن خیال ریاست کے سیاق وسباق میں اسے قابل عمل سمجھا جا سکے؛ ہم نے جس قدر تحریریں شائع کی ہیں ان کے ایک محتاط جائزے سے ان کاوشوں کا ثبوت خود بخود مل جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے سیاست دان اور سیاست دانی کے دعوے دار جواب شریعت کے نفاذ کی دہائی دے رہے ہیں، حقیقت میں انہیں اسلام کی سچائی یا مسلم عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ وہ اپنے ذاتی مفادات کی ترویج اور مقتدر مناصب کے حصول کے لیے صرف اسلامی نعروں کو استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری جانب اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ ان طریقوں سے حصولِ اقتدار کا خواب بھی پورا نہیں کر سکتے، کیا ہمارے لوگوں کی غالب اکثریت کی یہ دلی خواہش نہیں ہے کہ پاکستان کو ایک سچی اسلامی ریاست کے قالب میں پھلتے پھولتے دیکھیں۔ دوسرے لفظوں میں ذاتی مفادات رکھنے والی مختلف پارٹیاں صرف اس لیے اسلامی نعرے استعمال کر رہی ہیں کہ ہمارے اکثر اہل وطن حقیقتاً دِل کی گہرائیوں سے اسلامی اصولوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور انہیں قیامِ پاکستان کا جواز صرف اور صرف اسلامی قانون کے نفاذ میں نظر آتا ہے؛ اور ظلماتی سوچ رکھنے والوں نے جو لوگوں کے ذہنوں کو قابو میں کر رکھا ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ حصولِ آزادی سے پہلے ان سے جو وعدے کیے گئے تھے، حکومت کی طرف سے وہ وعدے پورے نہیں کیے گئے اور یہ لوگ ان سے مایوس ہو چکے ہیں۔

ہماری خود مختاری کے پہلے ہی ہفتے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ لوگوں کی معاشرتی خود اعتمادی کا انحصار تقریباً مکمل طور پر، اس بات پہ ہو گا کہ حکومت انہیں واضح طور پر اسلام کی جہت پر لے کر چلتی ہے یا نہیں چلتی: کیوں کہ یہی ایک امید تھی جو اتنے سالوں پر محیط سیاسی جدوجہد کے دوران ان کے ذہنوں میں تھی۔ اسی مقصد کے لیے محکمۂ احیائے ملتِ اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کا خاکہ ایک طرح کے "نظریاتی منصوبہ سازی مرکز" کے طور پر تیار کیا گیا تھا جو اس اسلامی جوش جذبے کو بھی برقرار رکھے جو پاکستان بننے کا سبب بنا اور ہمارے ہم وطنوں کی جذباتی قوت کی تعمیری مقاصد کی طرف چلنے کی رہنمائی بھی کرے۔ یہ بالکل ظاہر سی بات تھی کہ اس قسم کی رہنمائی کے بغیر ہمارا معاشرتی وجود خطرے میں پڑ سکتا تھا: کیوں کہ یا تو "مولوی" عنصر لوگوں کو پھٹے پرانے، ناقابل عمل، بوسیدہ فقہی تصورات کے ساتھ چمٹے رہنے کی ترغیب دے دے کر اسلامی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کو ناممکن بنا دیتا، دیگر صورت میں ہمارے پاس تین اختیار ہوتے؛ یا تو قدامت پسند اور تدبر نہ کرنے والے عناصر (جو مولوی کی اصطلاح کے تحت آتے ہیں) کو اجازت دے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو اکیلے اسلام کے برحق نمائندے کے طور پر پیش کرتے، اور اس طرح مستقبل میں ایک طویل عرصے کے لیے، ہماری سماجی، معاشی اور فکری ترقی کو روک دیتے؛ یا اپنے ہم وطنوں کے جذباتی قوت کے پورے کے پورے عظیم ذخیرے کو، جس کا مرکزی نقطہ اسلامی نظریہ ہے، گم ہو کر معدوم ہو جانے دیتے؛ یا پھر جذبے کی اس عظیم طاقت کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان کو حقیقی اسلامی ریاست بنانے کی سعی کریں۔ جسے ایک روشن خیال، مضبوط اور ترقی پسند سیاسی نظام کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کی بدولت اسے پوری مسلم کی قیادت کے منصب پر فائز کیا جا سکے۔ واضح سی بات ہے، ان تینوں امکانات میں سے آخری ہی اس قابل ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جا سکے۔ یہ بات بالکل درست طور پر خود قائد اعظم نے بھی متعدد موقعوں پر واضح فرمائی۔ آپ ہمیشہ پاکستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اسے "a State of our own concept" (ہمارے اپنے تصور پر مبنی ریاست) قرار دیتے تھے، جو اپنی رہنمائی قرآنِ مجید سے حاصل کرے گی اور اس کا اسلامی شریعت پر مبنی ایک دستور بھی ہو گا۔ یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ قائد اعظم کبھی ایسی بات نہیں کرتے تھے جو ان کی مراد نہ ہوتی؛ اور یہی اعتماد تھا جس کی بنیاد پر حکومت مغربی پنجاب نے ایک محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ (Department of Islamic Reconstruction) قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی

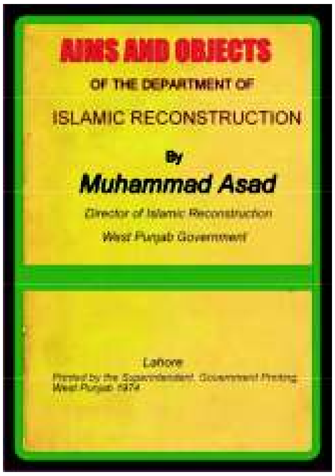

محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ کا کتابچہ

جو شہنائیاں مولوی بجا رہے ہیں ان سے بہت دور، اس محکمے کا مقصد اپنے قیام کے روزِ اول سے اسلامی قانون کے ایسے تصور کا فروغ ہے جو حقیقی طور پر قرآنِ مجید کے پیغام سے مطابقت رکھتا ہو، اور اس وجہ سے مکمل طور پر ترقی پسندی پر مبنی اور قابلِ عمل ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام، اللہ

تعالیٰ کا قانون ہونے کی حیثیت سے، کسی خاص زمانے کے سماجی اور معاشی حالات کے ساتھ منتھی نہیں ہے، اس لیے وہ ہم سے ہماری تاریخ کے گزرے اوقات میں رائج ہر قانونی رائے کو ہر حال میں تسلیم کرنے کا تقاضا نہیں کرتا۔ جب ہم شریعت کی اصل بنیاد وحی الٰہی کو تسلیم کرتے ہیں، تو ہمیں لازماً یہ بھی مان لینا چاہیے کہ ہر زمانے کے سماجی، معاشی اور فکری تقاضے بھی اس میں پہلے سے سمو دیے گئے ہیں: مطلب یہ ہے کہ شریعت کا تصور ایک جامد طریقے کے طور پر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ انسانی ترقی کے تمام امکانات کی اس میں گنجائش ہونا، نیز اس کا انسان کی سماجی نشو ونما کے تمام مراحل کی ضروریات کے مناسب حال ہونا ضروری ہے۔ اب یہ بات خود بخود واضح ہے کہ اسلام کی وہ تصویر جو ہمارے پیشہ ور علماء کی اکثریت پیش کررہی ہے، وہ آج کے معاشرے کی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتی، کیوں کہ وہ مکمل طور پر جامد اور قانون کے ان تصورات کے ساتھ منتھی ہے جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے عظیم محققین کے ہاں جاری تھے۔ اس بنا پر، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ، یہ تصویر شارع کے صحیح مقصد کی ترجمانی نہیں کرتی۔ کیوں کہ ان عظیم محققین کے قانونی استنباطات ان کے اپنے زمانے میں، اور اسی زمانے کے لیے، عمل میں لائے گئے تھے، اور وہ زمانے کے ساتھ مقید تھے، اس معنی میں کہ وہ اس خاص زمانے کے سماجی اور فکری پس منظر کے ساتھ موافق بنائے گئے تھے - اور اس وجہ سے وہ ”حتمی" نہیں ہوسکتے تھے، اس معنی میں کہ وہ تمام زمانوں کے لیے حتمی طور پر قابل نفاذ نہیں تھے۔ یہ نقطہ گزشتہ ایک ہزار سال یا اس کے قریب زمانے تک اکثر - اگرچہ یقیناً سب نہیں - علماء کی نظروں سے اوجھل رہا۔ انہوں نے ہر قسم کے خود مختار اجتہاد پر پابندی لگادی، خود غور وفکر کرنا بھی بند کردیا اور محض اپنے زیادہ تخلیق کار اسلاف کے فکری نتائج پر دارومدار رکھنے کی عادت بنالی۔ انہوں نے انسانی زندگی کی تبدیلیوں اور تاریخی تجربے (جس میں میں سائنسی تجربے کو بھی شمار کرتا ہوں) کی بنیاد پر اسلامی فکر کو ترقی دینے کی بجائے، وہ اطمینان اور خوشی سے وہی نظریات اور تصورات دہراتے رہے جن کا رواج بہت پہلے ماضی میں ہوا تھا: جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام آہستہ آہستہ تمام تخلیقی افکار سے خالی ہوتا چلا گیا، اس نے اپنی سابقہ ثقافتی قوت کھودی اور وہ رفتہ رفتہ بدلے اوقات کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی سے دور ہوتا چلا گیا۔

یہ، بالاختصار، اسلام کے ابتدائی زمانے کی شاندار شروعات کے بعد اس کے مرحلہ وار تنزل کی وضاحت ہے؛ اور یہی ہر قسم کے زندہ غور وفکر کی بندش کی کہانی ہے، جس نے شریعت یا اس چیز کے جسے اس زمانے میں بے جا طور پر شریعت کا نام دیا جارہا ہے - جدید معاشرے کے سیاق وسباق میں مکمل طور پر نفاذ کو ناممکن بنادیا ہے۔ المختصر، یہ جو کچھ ناقابل عمل اور وقت کے تقاضوں سے دور ہے، وہ اسلام نہیں ہے، بلکہ اسلام کے بارے میں اور اس کے قانون کے بارے میں قائم کی گئی وہ آراء ہیں جو زمانے سے مقید قدیم فقہی جزئیات سے ماخوذ ہیں۔

اگر یہ نتیجہ تسلیم کرلیا جائے تو، ہمارے زمانے کے مسلم معاشرے کے لیے دو راستے کھلے رہ جاتے ہیں: یا تو وہ اسلام کے اصل پیغام کی طرف لوٹ آئیں اور اسلام کو ایک بار پھر اپنی سماجی اور ثقافتی ترقی کی عملی بنیاد بنانے کے نقطۂ نظر سے نئے سرے سے اس کی تطبیق کے بارے میں غور وفکر شروع کریں - یا اپنی سیاسی زندگی میں اسلام کے عمل دخل پر مکمل پابندی لگادیں، جیسے کے کمال اتاترک نے اپنے ملک میں کیا۔ میری نظر میں پاکستان کے معاملے میں اس دوسرے حل کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کے وجود کا مکمل طور پر انحصار ہی اسی حقیقت پر ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے مذہبی نظریے کی بنیاد پر اپنے لیے الگ قومیت کا دعویٰ کیا تھا - اور اب تک یہی دعویٰ کررہے ہیں۔ کئی سالوں تک ہم دلائل دیتے رہے کہ جب تک برصغیر کے مسلمانوں کے پاس اپنی کوئی ریاست نہیں ہے تو ان کے لیے بطورِ مسلمان اپنی پہچان برقرار رکھنا ممکن ہوگا۔ اس بات سے انکار کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ ہماری الگ ریاستی ڈھانچے کے حصول کی خواہش کا منشا ہمارے لوگوں کا یہ فطری عزم تھا کہ ان کے پاس زندگی

اسلامی مملکت پاکستان کے قیام کے بعد مسلمانوں کی ہجرت

گزارنے کی اپنی کوئی جگہ ہو، جہاں اسلام کا جوہر نشوونما پاتے ہوئے محض ایک دعوت اور پیغام سے بڑھ کر ایک مکمل سیاسی حقیقت بن جائے۔ صرف اسی سے، نہ کہ کسی اور چیز سے، ہمیں ہندوستان سے علیحدگی کی جنگ لڑنے کا حوصلہ ملا؛ اس سے بھی بڑھ کر: علیحدگی کی جنگ کا جواز ہمیں صرف اسی سے ملا۔ تعمیر پاکستان میں اسلام کے حقیقی کردار کا انکار، پاکستان کے وجود کے حق کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

ظاہر سی بات ہے، کسی معاشرے میں اسلام کو اس وقت تک اپنائیت حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک اس کے قانون کو اس معاشرے کے قانونی نظام کی بنیاد نہ بنایا جائے: اس بناپر نفاذِ شریعت کا مقبول عام مطالبہ ہماری قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد، اور پھر پاکستان کے حصول کا ایک جائز نتیجہ ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، شریعت کا روایتی تصور، جیسے کہ رجعت پسند مولوی صاحبان اس کی وکالت کرتے ہیں-ملت کے بہترین مفادات کے مطابق نہیں ہے: کیوں کہ وہ اصلی اور کامل بالذات شریعت نہیں ہے جیسے اس کا تصور قرآنِ مجید میں اور نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں پیش کیا گیا ہے، بلکہ وہ ایک مجموعہ جاتی ڈھانچہ ہے جس میں-مستند شرعی قوانین کو چھوڑ کر-بہت سے یک طرفہ رائے پر مبنی، وقت کے ساتھ مقید استنباطات اور اضافہ جات شامل ہیں: جو ایسے شرعی قوانین، استنباطات اور ان کے اضافہ جات سے ماخوذ ہیں، جو ہزاروں سال پہلے رائج العمل فکری اور سماجی حالات کی روشنی میں مہیا ہوئے تھے۔ اس لیے اگر، اسلام نے ہمارے زمانے میں "عملی منشور" بنناہے، اور اس نے عملی منشور کے طور پر کام کرنا ہے، تو ہمیں اپنے آپ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک نئے اجتہادی عمل میں لگانا ہوگا دوسرے لفظوں میں، ہم موجودہ فقہی ذخیرے میں شامل، وقت سے مقید تمام روایتی فقہی تشکیلات کا جائزہ لے کر قرآن وسنت کے بارے میں ہمارے اپنے فہم کی روشنی میں فقہی تشکیل ترتیب دینے کو ہدف بنا کر کام کرنا شروع کردیں۔ مجھے یہاں یہ بات بھی واضح کردینی چاہیے کہ اس عمل میں سوال "اسلامی قانون" کی "نئے سرے سے تقسیم" کا نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے، وہ تو اپنی کارآمدگی کے لحاظ سے حتمی ہے۔ البتہ وہ امور جن کا تعلق اس قانون (شریعت) کی تعبیرات اور بہت سے ایسے امور سے متعلق ہے جن میں شرعی احکام کو براہِ راست واضح قانونی شکل نہیں دی گئی ہے، لازمی طور پر ہماری ہمارے اس پروگرام کا موضوع ہونے چاہئیں جس میں ہم زندگی کے حقائق کو ترقی پسندانہ طریقے سے اپنے دائرۂ عمل میں لانا چاہتے ہیں، میری اس سے مراد اجتہادی عمل کا تسلسل ہے۔

قائداعظم اور مفتی فلسطین قاہرہ میں ایک عشائیہ میں موجود ہیں (۱۹۴۶ء)

(میں کئی سال سے اس موضوع پر لکھتا چلا آرہا ہوں، اور یہاں اس پر مزید بحث اس یادداشت کی گنجائش سے بہت دور نکل جائے گی۔ بہر حال تیار حوالے کے طور پر، میں نے اس مسئلے کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان "اسلامی قانون کے اصولوں کے بارے میں [On the Principles of Islamic Law]" ہے)۔

مندرجہ بالا سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس ملک میں پورا قانونِ شریعت یکدم نافذ کرنا نہ قابلِ عمل ہوگا اور نہ ہی ایسا کرنا چاہیے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی ابھی قانونی تدوین نہیں ہوسکی: اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ روایتی فقہی تصورات کے عملی قانون سازی میں استعمال سے قبل ان کی ایک بار جامع نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس لیے نفاذِ شریعت کی کارروائی ایک طویل عمل ہونا چاہیے، جو کئی سالوں پر محیط ہو۔

فطری سی بات ہے کہ اس سمت پہلا قدم شریعت کی قانونی تدوین ہوگا (اس لفظ کے درست اور اصل مفہوم کے مطابق)۔ اس مقصد کے لیے، میں

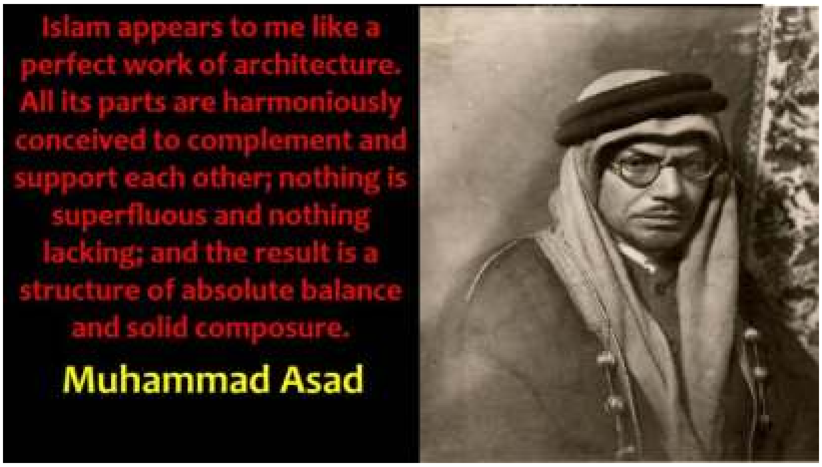

نے کچھ عرصہ قبل درج ذیل تجاویز مرتب کی تھیں، جنہیں یہاں لفظ بلفظ دوبارہ تحریر کر رہا ہوں (یہ تجاویز "عرفات"، مارچ ۱۹۴۸ء کے صفحہ ۱۱-۱۲ پر شائع کی گئی تھیں)[3]:

"ایک بہت بڑی مشکل جو اب تک اسلامی تعمیرِ نو کے لیے کوئی واضح لائحۂ عمل تیار کرنے میں رکاوٹ ہے، وہ معاشرتی معاملات سے متعلق شرعی قوانین کی یکساں ضابطہ بندی کی عدم دستیابی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت ملت کے درمیان جو سب سے بڑا پریشان کن تذبذب پایا جاتا ہے وہ اس بات میں ہے کہ کیا "اسلامی" ہے اور کیا "غیر اسلامی"، اور بے یقینی کی یہ کیفیت تمام سماجی و معاشی منصوبوں اور تجاویز میں ہے جن پر آج کل ہر طرف خوب بحث چل رہی ہے۔ اس معاملے میں جو اختلافات مختلف مکتب ہائے فکر کے درمیان - جدید اور قدیم دونوں میں - پیدا کیے جا رہے ہیں، جو زیادہ تر، قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے طریقوں اور اس سلسلے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کی پیداوار ہیں۔ جب تک ان اختلافات کو ہم آہنگی میں نہیں بدلا جاتا- کم از کم ایسے امور میں جن کا تعلق مشترکہ عملی مسائل سے ہے- اسلامی اقدامی عمل (Islamic action) کا کوئی ایسا لائحۂ عمل ترتیب دینا ناممکن ہے جو اپنے آپ کو تمام موجود مکاتب فکر یا کم از کم اکثر مکاتب فکر سے اپنا آپ منوا سکے۔ پیچیدگی اور اختلاف کی جس حد تک مسلم فقہ گزشتہ صدیوں میں پہنچ چکی ہے، اس کے پیش نظر، فی الحال ایسی کوئی بھی کوشش فضول ہو گی جس کا مقصد موجودہ فقہی اختلافات کو ختم کرنا اور تعبیر واجتہادی استنباطات کے مختلف طریقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہو، جو دراصل اس پیچیدگی کا سبب ہیں۔ لہٰذا اگر، اسلامی اقدام کے لیے کوئی عملی اور قابلِ عمل تجویز پیش کرنی ہے تو، فی الحال ہمیں ان تمام امور سے قطع نظر کرنا ہو گا، جن میں تعبیر اور استنباط کی ضرورت ہے، اور ہمیں صرف ان شرعی قوانین پر توجہ مرکوز کرنا ہو گی جو بذاتِ خود واضح ہوں اور اسی وضاحت کے ساتھ قرآن و سنت کے ظاہری الفاظ پر مشتمل ہوں، اور ان کے بارے میں مختلف اسلامی مکاتبِ فکر میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ اگر ایسے قوانین کی تدوین ہو جائے، تو ان سے اسلامی معاشرتی تعمیرِ نو کا مقصد حاصل کرنے کے لیے کم از کم متفقہ بنیاد میسر آ جائے گی"۔

لہٰذا، اس محکمے کی تجویز ہے کہ، تمام مکاتبِ فکر کے معتبر علماء سے درخواست کی جائے، اور وہ اپنے قابل ترین نمائندے، مستقبل میں زیر تشکیل ایک شریعت کمیٹی کے رکن بننے کے لیے نامزد کریں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہو گا کہ قرآن و سنت کے ان معاشی اور اجتماعی احکام کی تدوین اور ضابطہ بندی کرے جنہیں نصوص کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے- یعنی جو مکمل طور پر واضح ہوں- اور ان کے الفاظ کے واضح ہونے کی وجہ سے ان کی کسی اختلافی تعبیر و تشریح کی گنجائش ہی نہ رہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس عمل سے نئے شرعی قوانین "وضع کرنے" یا پہلے سے موجود شرعی قوانین کو ہی "نئے سرے سے وضع کرنے" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حوالے کی جو شرائط کمیٹی کو جاری کی جائیں گی، ان کے مطابق کمیٹی صرف قرآن مجید اور معتبر روایات، جو

3 عرفات اردو، جلد ۱، عدد ۱، مارچ ۱۹۴۸ء، جمادی الاول ۱۳۶۷ھ، ص ۱۷- ۲۴؛ عرفات انگریزی: مارچ ۱۹۴۸ء، عدد ۱، ص ۱۱- ۱۲۔ اس سے قبل علامہ اسد نے پورا پروگرام محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے اغراض و مقاصد (انگریزی)، ۱۹۴۷ء میں شائع کر چکے تھے۔ یہاں انہوں نے اس مفصل پروگرام کا خلاصہ شامل کیا ہے

تمام مکاتبِ فکر کے ہاں قابل قبول ہوں، سے معلوم ہونے والے مجموعی احکام کو جمع کرے گی، اور خاص عناوین کے تحت ان کی ضابطہ بندی کر دے گی۔ امید ہے کہ اس طریقے سے نسبتاً مختصر حجم کا ایک ضابطہ میسر آجائے گا، جسے مختلف مسلم مکاتبِ فکر کے درمیان ایک طویل ترین غیر فرقہ وارانہ قدر مشترک قرار دیا جا سکے گا۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو، ملت کے پاس معاشرتی اہمیت سے متعلقہ سوالات کے بارے میں ایک کم از کم شرعی ضابطہ مہیا ہو جائے گا، جو بعد میں مزید غور و فکر کی بنیاد اور عملی قانون سازی کے نقطۂ آغاز کا کام دے سکتا ہے"۔

میں آپ کی توجہ مندرجہ بالا بیان کے آخری جملے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس سے یہ بات واضح ہے کہ شرعی قوانین کی ان خطوط پر ضابطہ بندی بھی جن کی نشان دہی میں نے کی ہے، خود بخود معاشرتی قوانین کے ایک تیار ضابطے کے طور پر نافذ العمل نہیں ہو جائے گی۔ دراصل، یہ ضابطہ بندی ہمیں اپنے مستقبل کے معاشرتی قانون کی محض ایک بنیاد فراہم کرے گی، نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ، اور ان شرعی ہدایات کو ایک عملی اور مفصل قانون سازی کی صورت میں ڈھالنا ہمارے اجتہادی عمل پر منحصر ہو گا۔ ظاہر ہے، اس عمل کے لیے حقیقی علماء کا میسر آنا شرط اولین ہو گا، جو نہ صرف شریعت کے سیاق و سباق سے واقف ہوں بلکہ عصری زندگی کے تمام پہلوؤں کو بھی جانتے ہوں۔ ایسے علماء، نادر الوجود ہیں، -ایک محتاط اندازے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ -ہمارے معاشرے میں موجود نہیں ہیں: اس بنا پر ایک اسلامی دارالعلوم کے قیام کی شدید ضرورت ہے، جو اس تقاضے کے مطابق علماء کو تربیت دے سکے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بہت پہلے ہی، جنوری ۱۹۴۸ء، میں مغربی پنجاب کی حکومت کو ایک عصری دارالعلوم قائم کرنے کے لیے پلاننگ کمیٹی بنانے کی تجویز دے دی تھی۔ میری تجویز مان لی گئی تھی، اور عزت مآب سربراہ کی طرف سے مجھے اس کمیٹی کا اجلاس بلانے کا اختیار سونپ دیا گیا تھا۔ میں علماءِ کرام کو خواہ مخواہ مخالفت میں بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ چناں چہ میں نے اس کمیٹی کی صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی کو پیش کر دی جسے انہوں نے قبول فرمالیا۔ اسی مقصد کے لیے، مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد علماء کو بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا، البتہ میں نے اس میں جدید تربیت یافتہ علماء کو خاص جگہ دینے کا اہتمام کیا۔ کچھ غیر متعلقہ مشکلات کی وجہ سے اس موضوع پر کام شروع کرنا فی الحال ممکن نہیں ہو سکا۔

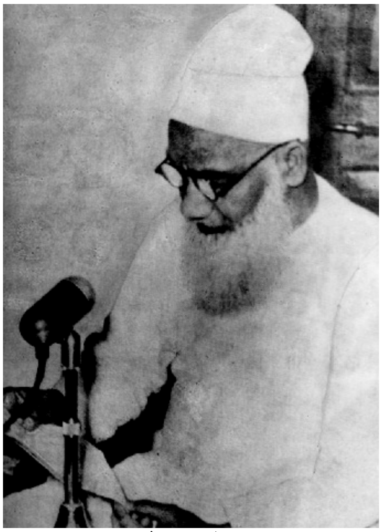
مولانا شبیر احمد عثمانی

مزید آگے بڑھنے سے قبل میں یہاں ان فرائضِ منصبی کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو محکمۂ احیائے ملت اسلامیہ نے پورے کرنا تھے -اور جو کہ وہ پورے کر سکتا ہے، اگر حکومت اس کے بنیادی اغراض و مقاصد سے اتفاق کرے۔

اغراض و مقاصد اختصار کے ساتھ ایک مضمون بعنوان "اسلامی تعمیر نو" (عرفات، مارچ ۱۹۴۸ء، ص ۶- ۱۵) میں بیان کیے گئے تھے، مجھے امید ہے وہ پہلے سے حکومت کے علم میں آچکے ہوں گے۔ ان اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمارے محکمے نے چار شعبوں میں کام کرنے کا پروگرام بنایا:

(۱) شعبۂ تحقیق: اس شعبے کا بنیادی ہدف مندرجہ بالا "شریعت کمیٹی" قائم کرنا اور اس کی رہنمائی کرنا ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ، شعبے کا کام قانونِ اسلامی کی روشنی میں مخصوص سماجی اور معاشی سوالات کے مناسب اور واضح جوابات دینا ہو گا۔ اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں- جیسے ذاتی زمینوں اور جائدادوں کو قومیانے کا مسئلہ، اور اصل زر اور محنت کا آپس میں تعلق، بینکنگ اور انشورنس، وغیرہ وغیرہ جنہیں شریعت نے متعلقہ زمانے کے مطابق اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے، مگر ان کا مکمل حل تلاش کرنا ضروری ہے، اگر ہم اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام تمام زمانوں اور ثقافتی ترقی کے تمام مراحل کے لیے قابل عمل ہے۔ جب تک ہم یہ دکھا دینے کے قابل نہیں ہو جاتے کہ اسلامی دستور العمل نہ صرف لوگوں کو روحانی اطمینان بخشے گا بلکہ وہ انہیں روٹی، مکان، سود، پیداوار دینے والا کام- خلاصہ یہ کہ، کم از کم معاشرتی تحفظ- بھی فراہم کرے گا تو اس کی روحانی تاثیر ختم ہو جائے گی اور میدان کمیونسٹ پروپیگنڈے کے لیے خالی ہو جائے گا۔ ہمارے مولوی صاحبان اب

تک صرف گزرے زمانوں کے حقائق پر خوشیوں کے شادیانے بجاتے رہے اور اسلامی خطوط پر معیشت کی تشکیل کے لیے کوئی ٹھوس تجاویز نہ دے سکے۔ ہمارے محکمے کا شعبۂ تحقیق قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک طرح کی لیبارٹری بن جائے، جس میں ہمارے وجود کے تازہ مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے جدید تحقیقی طریق کار کے مطابق حل پیش کیا جائے۔ ہمارے دائرۂ کار میں آنے والے سماجی مسائل میں سے ایک مسئلہ، "پردہ" ایک اہمیت کا مقام رکھتا ہے۔ امید ہے کہ ہماری تحقیق قرآن مجید اور اسوۂ نبی کریم ﷺ کی بنیاد پر یہ ثابت کردے گی کہ پردہ اسلام کے معاشرتی نظام میں شامل نہیں ہے، اور یہ کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں یقیناً وہ روبہ عمل نہیں تھا۔

(۲) **شعبۂ تعلیم:** یہ شعبہ اپنی توجہ زیادہ تر ایک جدید دار العلوم کے قیام اور اسے چلانے پر مرکوز کرے گا۔ تجویز یہ ہے کہ جو صاحب دار العلوم کے پرنسپل ہوں، وہی بلحاظِ عہدہ محکمہ اِحیائے امتِ اسلامیہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی ہوں۔ شاید سب سے بہتر بات یہ ہوگی کہ اس منصب پر کسی ترقی پسند مصری محقق کا تقرر کیا جائے، جس نے جامعہ ازہر سے تعلیم حاصل کی ہو، ضروری وسعت نظر بھی رکھتا ہو اور اسے دنیوی امور پر بھی خوب عبور حاصل ہو، کیوں کہ اس بات میں ایک گونہ ابہام ہے کہ ہمارے اپنے علماءِ کرام میں سے کوئی مناسب صاحب مل سکیں گے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ حضرات ہو سکتا ہے بہت اچھی نیت کے مالک ہوں اور وسعت ظرف بھی رکھتے ہوں، مگر یہ طے شدہ ہے کہ وہ عصری زندگی کے مسائل سے واقف نہیں ہوں

جامعہ ازہر قاہرہ کا ایک منظر

گے۔ شعبۂ تعلیم کا دوسرا کام ہمارے تمام سکولوں اور کالجوں میں اسلامی تعلیم میں رابطہ قائم رکھنا ہوگا، اس کا مقصد اپنے پورے تعلیمی نظام میں صحیح اسلامی روح پھونکنا ہوگا۔ تعلیمی کانفرنس کی سفارشات بہت عمومی نوعیت کی ہیں، اور انہوں نے بہت وسیع اختیار صوبائی یونیورسٹی کمیٹیوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں دیگر مسلم ممالک کے تجربے سے بھی ضرور استفادہ کرنا ہوگا، خصوصاً مصر سے: اور ہمارا شعبۂ تعلیم پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے درمیان مستقل تعلقات بھی قائم کر سکتا ہے اور تعلیمی نقطہ ہائے نظر کا تبادلہ بھی کر سکتا ہے۔

(۳) **شعبۂ تبلیغ و نشرواشاعت:** اس شعبے کے فرائضِ منصبی واضح ہیں۔ یہ اخبارات، ریڈیو اور خطاب کے ذریعے صحیح اسلامی تصورات کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے گا۔ ہمارا اہم ترین مقصد اپنے ہم وطنوں کی معاشرتی خود اعتمادی / اجتماعی اخلاقیات کی تعمیرِ نو ہے، جو، ہماری معلومات کے مطابق اتنی گہرائیوں میں گر چکی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ میری رائے میں، بدعنوانی کے خاتمے اور اعلیٰ پیمانے کے سماجی تعاون کے لیے حکومت کے تمام اقدامات کی بنیاد اضطراب و بے چینی کی چٹانوں، تخیلات و توہمات اور اخلاقی بے حسی پر رکھی گئی ہے، جس میں ہماری قوم گری ہوئی ہے، جس کی غالب وجہ حصولِ آزادی کے بعد لوگوں کو حکومت کی طرف سے کوئی واضح ہدف نہ دے پانا ہے، جس کے لیے وہ جدوجہد کرتے۔ واضح ہدایات پر مبنی جذبے اور عملی

مثالیت کے بغیر، قومیں حتمی طور پر اخلاقی اور سیاسی دونوں سطحوں پر بکھر جاتی ہیں: اس مسئلے کا ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے کہ، ہماری قوم کو یہ یقین ہو جائے کہ، حکومت پاکستان واقعتاً اسلامی خطوط پر ایک سیاسی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ میں اس موضوع پر بعد میں اسی یادداشت میں مزید گفتگو کروں گا۔

(۴) **شعبہ ٔاصلاحاتِ قانون سازی:** اس شعبے کا کام قانون سازی میں اسلامی خطوط پر اصلاحات لانے کے بارے میں حکومت کو واضح تجاویز دینا ہوگا۔ واضح سی بات ہے کہ ہم صرف ایسے معیارات کی تجویز دیں گے جن کا موجودہ حالات میں عملی نفاذ ممکن ہوگا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خیالی تجاویز نہیں دی جائیں گی جیسے کہ ہمارے مولوی صاحبان کی ترجیحات ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ، آج کل ہم ایک "قانونِ زکوۃ" کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف ہیں جو، جب تیار ہو جائے گا، مرکزی حکومت کے غور کے لیے پیش کیا جائے گا۔ (وجہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ دستور کے مطابق، کوئی زکوۃ بل صوبائی اسمبلی پاس نہیں کر سکتی، خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ زرعی زمین کے علاوہ، جائداد اور سرمائے پر لگائے جانے والے تمام ٹیکس، وفاقی فہرست کے اندر شامل ہیں)۔ اس مسودے کی تیاری میں رابطہ کاری تو ایک بنیادی ضرورت ہے، اس کے علاوہ اس میں ان تمام مکتب ہائے فکر کی آراء شامل کی جائیں گی جو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے (اَ) کہ مسلمانوں سے زکوۃ کی وصولی سے حکومت پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہو جائے گی کہ وہ اور کسی طرح کے ٹیکس عائد کرے، اور (ب) یہ کہ ایک اسلامی حکومت کو اختیار حاصل ہے کہ حسبِ ضرورت کچھ خصوصی ٹیکس عائد کرے، اگرچہ یہ ٹیکس ان عناوین کے تحت ہی لگائے جائیں جن پر زکوۃ کے قانون کے تحت لگائے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا دو مسائل کا پوری مسلم تاریخ میں کبھی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا، اور ہم اس معاملے میں ایک طرح سے قائدانہ کام کر رہے ہیں۔ (یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ، جملہ معترضہ کے طور پر، کہ اس مسودے کی بنیاد پر جو ہم اب تیار کر رہے ہیں، حکومت کو دیگر تمام ٹیکسوں کے علاوہ، اضافی آمدن کے طور پر کئی کروڑ حاصل ہوں گے، جسے مسلم قوم اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ادا کرے گی، اور اس کا استعمال سماجی فلاح وبہبود کے اقدامات کے لیے کیا جاسکے گا، جیسے بے روزگاری الاؤنس، سماجی بیمہ اور فلاح وبہبود کے دیگر بہت سے اخراجات جو اب تک عام بجٹ میں سے اٹھانا پڑتے تھے)۔

مندرجہ بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم شریعت کو (اس لفظ کے وسیع مفہوم کے طور پر) یکدم نافذ کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کے برعکس، مجھے یقین ہے کہ یہ کام صرف ایک منصوبے کے تحت تیار کردہ لائحہ ٔعمل کے مطابق کیا جاسکتا ہے جو کم از کم دس سال کی مدت پر محیط ہوگا۔ اس منصوبے سے متعلق ہمارے محکمے کا عمومی کام یہ ہوگا کہ وہ اسلامی قانون کے مسئلے کی ایک نئی، تعمیری سوچ تیار کرے گا، اور اس طرح اسے اپنے زمانے کے لیے ایک عملی دستور کار بنا کر پیش کرے گا۔ البتہ، ایک سرکاری محکمہ ہونے کی بنا پر، ہم امکانی طور پر اس وقت تک کوئی قابل ذکر کام نہیں کر سکتے جب تک حکومت یہ فیصلہ نہ کرے کہ اسلام کا قانون اس کی حکمتِ عملی کا تشکیلی عنصر ہوگا، اور پھر یہ فیصلہ ایک سرکاری بیان کے ذریعے عوام میں عام کرے۔ اس طرح میں اس یادداشت کے مرکزی نقطے پر پہنچ گیا ہوں۔

انتہائی اعلیٰ سطح پر کیے گئے بہت سے اعلانات کے باوجود کہ پاکستان کو قرآن کی روح کے مطابق چلایا جائے گا، بڑے پیمانے پر یہ تاثر پنپ رہا ہے کہ اس وعدے کی تکمیل کے لیے اب تک کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا گیا، اور یہ کہ، اس کے برعکس، اس بات کے کافی شواہد مل رہے ہیں کہ حکومت اعلانیہ طور پر مغربی دنیا کے طرز پر دھیرے دھیرے "سیکولرازم" کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عام تاثر درست ہے یا نامکمل

معلومات کی بنیاد پر قائم ہوا ہے؛ مگر یہ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے حکمتِ عملی کے بارے میں ایک صاف اور واضح اعلان کے بغیر ہمارا محکمہ لوگوں کو اس بات پر مطمئن نہیں کر سکتا کہ "اسلامی تعمیرِ نو / محکمہ اِحیائے ملت اسلامیہ" کی حیثیت ایک تشہیری آلہ کار سے زیادہ بھی کچھ ہے۔

میں ذاتی طور پر یقین رکھتا ہوں - اور میں اس یقین پر ہر ممکن زور دے کر تاکید کرنا چاہتا ہوں - کہ نظریاتی ابہام جو ہماری آج کی زندگی کا ایک کردار بن چکا ہے، اس کا نتیجہ سیاسی بے چینی اور انتشار کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک سیاسی طور پر زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اصول پرستی کے ایک معین معیار اور جذباتی وحدت سے سرشار نہیں ہوتی؛ اور ہمارے معاملے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس طرح کی اصول پرستی اور اس معیار کی وحدت فراہم کر سکے، ہمارے لیے اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ ہم اسلام پر شعوری یقین رکھتے ہوں اور اسے ایک سیاسی حقیقت میں ڈھالنا ہماری خواہش ہو۔

ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے وہ لوگ جو پاکستان کے مستقبل کی تشکیل ایسے خطوط پر چاہتے ہیں، مثال کے طور پر کہہ لیجیے کہ: ترکی کی طرز پر، تو وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے (نہ ہی، غالباً اپنے آپ کو) کہ اگر اسلام کو ہمارے معاشرے کی تعمیر میں ممتاز حیثیت نہیں دی جاتی تو پاکستانی "قومیت" کی بنیاد کیا ہو گی۔ ترکی یا برطانیہ کی مثال، یا حتیٰ کہ عرب ریاستوں کی مثال ایک ایسے ملک کے لیے مناسب نہیں جیسا ہمارا ملک ہے: کیوں کہ، ان تمام ریاستوں میں یا تو زبان کی بنیاد پر ایک بہت بڑی ہم آہنگی ہے، یا نسلی بنیاد پر، اور اس بنیاد پر وہ ہر تاریخی اور ثقافتی مفہوم میں "قومیں" ہیں، جب کہ پاکستان کے معاملے میں اس ساری بیرونی ہم آہنگی کا عنصر سرے سے موجود ہی نہیں (جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لفظِ "قوم" کے روایتی مفہوم میں ایک قوم نہیں ہیں)۔ اگر ہم اس معاملے کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیں، بے کار کے حیلوں بہانوں کے بغیر، تو ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ یہاں کونسی بنیاد ہے؟، ان کے اسلامی شعور کے علاوہ، جو پنجابیوں، پٹھانوں، بنگالیوں اور سندھیوں کے تمام کے مختلف طبقات کو یکجا کر کے ایک مضبوط قومی وحدت میں سمو دے۔ ہمارا تعلق مختلف نوعیت کی نسلوں سے ہے، ہم مختلف زبانیں بولتے ہیں - اگرچہ، اردو غالباً ایک نہ ایک دِن ہم سب کی مشترکہ زبان بن جائے گی، پھر بھی وہ اصل مادری- زبان تو ان تمام گروہوں میں سے کسی کی بھی نہیں ہے، جو اس ملک کے باشندے ہیں۔ مختصر یہ کہ، ہمارے پاس نسلی شعور یا لسانی روایت کی وہ وحدت نہیں ہے جو دوسری قوموں کی "قومیت" کو تشکیل دیتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہم اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں - یا، اس کی بجائے یہ کہ، ہم ایک قوم ہیں - اس کی جڑیں کسی اور چیز میں ہیں: اور یہ کہ وہ اور چیز ہمارا یہ شعور ہے کہ ہم ایک نظریاتی گروہ ہیں۔ اسی نے، اور اس کے علاوہ کسی چیز نے نہیں، پاکستان کے قیام کا جذباتی اور عقلی جواز مہیا کیا ہے۔ اگر اسی شعور کو صحیح طور پر پُر عزم منصوبہ بندی کے ذریعے پروان چڑھایا گیا اور اس کی تعمیر کی گئی تو یہی پاکستان کو عظیم، طاقت ور اور ثابت قدم بنا دے گا؛ اور اگر ہم نے اسے نظر انداز کیا اور مغربی نظریات کی نقل کرتے ہوئے اسی بحث میں پڑے رہے کہ ایک جدید ریاست میں "کیا کرنا چاہیے" اور "کیا نہیں کرنا چاہیے"، تو ہم اتنی جلدی قومی سانحے سے دوچار ہو جائیں جتنا ہم میں سے بہت سوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔

احکامِ اسلام پر عدم رضامندی کا رویہ جس کی بنا پر ہمارا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ اس کے پاکستان میں نفاذ کی مخالفت کرتا ہے، کوئی بہت معقول رویہ نہیں ہے (اگرچہ ہمارے مولوی صاحبان نے دنیا کو اسلام کی بالکل مبہم تصویر دکھا کر یقیناً اس سلسلے میں بہت نقصان پہنچایا ہے)، باوجود اس حقیقت کے کہ جدید دنیا میں کسی جگہ بھی اسلام مؤثر طریقے سے نافذ نہیں ہے۔ انہیں ساری کی ساری فکر اس بات کی ہے کہ باہر کی دنیا کی نظروں میں وہ کہیں قدامت پسند شمار نہ ہوں، چناں چہ جب بھی ان سے کوئی شخص اس موضوع پر بات کرتا ہے، تو ان کا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ، "کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ شریعت کی بنیاد پر قانون سازی مصر یا ترکی میں بھی کہیں نافذ ہے؟" - پھر ان کی توقع یہ ہوتی ہے کہ، انہیں جواب نفی میں

ملے گا اور اس سے دلیل ان کے حق میں ثابت ہو جائے گی۔ دیگر تمام پہلوؤں سے قطع نظر، یہ رویہ تعمیری سوچ کی کمی کا ایک جھنجھوڑ دینے والا مظاہرہ ہے۔ مصر اور ترکی اور دیگر تمام مسلم ریاستیں، پاکستان کی طرح عوام کی طرف سے ایک شعوری نظریاتی مطالبے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں نہیں آئیں۔ ان کا قیام بعض صورتوں میں اصل اسلامی سلطنت ٹوٹنے کا نتیجہ تھا اور بعض دیگر صورتوں میں، بعد کے زمانوں میں مسلم فتوحات کا نتیجہ: اور ان میں سے ہر صورت میں نئی ریاستیں پہلے سے موجود، مخصوص نسلی یا قومی شناخت کی بنیاد پر قائم ہوئیں۔ اس طرح، وہاں کے باشندوں کی قومی شناخت ہی اب ان ریاستوں کی سیاسی بقا کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، ایک ایسی شناخت جس کا اس سوال سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ شعوری طور پر اور مؤثر طور پر اسلام کی اطاعت کرتے ہیں یا نہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو، بہر حال، ہمارے لوگوں کی "قومی" شناخت کا وجود اور عدم وجود ان کے نظریاتی شعور پر منحصر ہے- جو کہ، اسلام ہے۔ ہم اپنے مسلمان ہونے کی وجہ سے ایک قوم ہیں، کسی بھی اور وجہ سے نہیں؛ بیرونی دنیا کو یہ بات پسند ہو یا نہ ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے خود مختار ریاست اس خواہش کے علاوہ کسی اور بنیاد پر حاصل نہیں کی کہ ہمیں اسلامی نظریے کے لیے ایک وطن میسر آجائے۔

"پاکستانی حب الوطنی" کی ضرورت پر جس قدر بھی زور دیا جائے، ممکنہ طور پر اس سے قومی وحدت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا، جب تک ان جذباتی عوامل کو سامنے نہ رکھا جائے، صرف جن کی بنا پر حب الوطنی پنپ سکتی ہے۔ دوسری مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کا جہاں تک تعلق ہے، تو ان میں قومی ہم آہنگی کے جذبات یقیناً نسلی اور تاریخی وحدت کے شعور سے پیدا ہوتے ہیں، وہی اپنے لوگوں کو تحریک دیتے ہیں، وہی ہیں جو ایک ترک کو ترک ہونے کا شدت سے احساس دلاتے ہیں، ایک عرب کو عرب ہونے کا، اور ایک انگریز کو انگریز ہونے کا: اور اس طرح- اس سوال سے بالکل بے گانہ ہو کر کہ یہ چیز اخلاقاً صحیح ہے یا غلط- ان کی قومیت انہیں حب الوطنی کی بنیاد فراہم کر سکتی ہے، اور کرتی بھی ہے۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ صرف اور صرف ہمارا ایک مشترکہ نظریے کے ساتھ مضبوط تعلق ہی پنجابی اور بنگالی کے درمیان اور اسی طرح پٹھان اور سندھی کے درمیان تعلق کا ذریعہ بنتا ہے، اسی میں ضروری جذباتی طاقت ہے جو ہمیں جوڑ کر ایک قومی وحدت میں پرو سکتا ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا، جو کہ ہماری قومی وحدت کا عنصر ہے، اور پھر یہ توقع کرنا کہ، ہماری سیاسی خود مختاری کے حصول کے بعد، اسلام کو پیچھے کر کے محض "پس منظر کی سُروں" کا درجہ دے دینا- ایک ایسا درجہ جو مذہب کے لیے دوسرے ممالک میں قابلِ قبول ہے- ایک بہت بڑی غلطی ہو گی: کیوں کہ اس طرح کی توقع پاکستان کو سوائے اس کے اور کہیں نہیں لے جائے گی کہ وہ داخلی انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر، ہمارا ملک بری طرح صوبائیت کی روح کا شکار ہے، جو ہمیں زمانہ ماضی سے ورثے میں ملی۔ مکمل داخلی وحدت کی طرف اس عظیم پیش قدمی کے باوجود جو ہم نے پاکستان کے لیے اپنی جد وجہد کے دوران کی، ہمارے ہم وطن ابھی تک اپنے آپ کو پنجابی، سندھی، پٹھان اور بنگالی محسوس کرتے ہیں، اور کئی موقعوں پر وہ قومی وحدت کے مفادات کے مقابلے میں اپنے علاقائی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ اور کیا چیز ہے جو ذاتیت کے اس باریک خلا کو پُر کر سکتا ہے؟

اسلام کے علاوہ اور کیا ہے جو پٹھانوں کی "پٹھانستان" بنانے کی خواہش کو مغلوب کر سکے یا بنگالیوں کی اردو کو قومی زبان کے طور پر قبول کرنے سے نفرت کو ختم کر سکے؟ اگر آپ انہیں دس لاکھ دفعہ بھی کہیں کہ حب الوطن بن کر رہیں یا ریاستی وحدت کے مفادات کو سب سے مقدم رکھیں، تو

آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا، جب تک کہ آپ آہستہ آہستہ انھیں یہ شعور ذہن نشین نہ کروادیں کہ ان کا تعلق ایک فطری وحدت کے ساتھ ہے: اور یہ احساس صرف ان کے اندر یہ شعور گہرا ہونے کی صورت پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق ایک مشترکہ نظریاتی طبقے سے ہے، اور ان کا یہ اعتماد کہ یہ مشترکہ نظریہ- اسلام- ہی ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے خدوخال متعین کرنے میں فیصلہ کن عنصر ہوگا۔

اگر کچھ اور نہیں، پاکستان کی خالصتاً مفادات پر مبنی، دنیوی دلچسپیاں تعین کے ساتھ یہی تقاضا کریں کہ اسلامی نظریے کو ہمارے سیاسی نظام کی تشکیل میں مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے، تو یہ بات ثابت شدہ ہے کہ، اسلام کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں جو پاکستان کے بے جوڑ عناصر کو یکجا رکھ سکے: اسی طرح اسلام کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں جو اس ملک کو اور دیگر مسلم دنیا کو مؤثر طریقے سے ایک ساتھ رکھ سکے۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جو بلا شبہ ہر پاکستانی کے ذہن میں اہم ترین مقام رکھتا ہے۔

غیر مسلم اقوام کے آج کی مسلم دنیا کو متاثر کرنے والے دو دہکتے سلگتے مسائل کشمیر اور فلسطین کے بارے میں رویے نے بالکل واضح طور پر یہ دکھا دیا ہے کہ اپنے دائرے سے باہر مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں ہے۔ جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوتا ہے، مغربی دنیا کی ہمدردیاں ترجیحی بنیادوں پر غیر مسلموں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں فلسطین ایک مثال ہے؛ ریڈکلف ایوارڈ مسلم مفادات کے خلاف ان کے فطری رویے کی دوسری مثال تھا۔ مغربی سیاست دان یہاں تک تیار رہتے ہیں- جیسا کہ سوویت روس اور امریکا نے فلسطین کے معاملے میں کیا- مسلم دنیا کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کے لیے عارضی طور پر اپنے اختلافات دبا دیا کرتے ہیں۔ اس بنا پر، یہ واضح ہے، کہ مسلم اقوام اس وقت تک اپنا سیاسی وجود برقرار رہنے کی امید نہیں رکھ سکتے جب تک وہ ایک دوسرے کے قریب نہ ہو جائیں، اپنے وسائل کو یکجا نہ کرلیں اور بروقت ایک سیاسی وحدت میں جمع نہ ہو جائیں: ایک رابطہ مسلم اقوام۔ ان کی یکجا شدہ رجالِ کار کی استعداد اور معاشی وسائل دیگر مشترکہ سیاسی گروہوں کے دباؤ کے مقابلے میں جم کر رہنے کے لیے کافی ہوں گے، بلکہ امید ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں جو مخالف فریقوں میں بٹ چکی ہے، یہ جمع شدہ وسائل اس میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بھی کافی ہوں گے: جب کہ، دوسری طرف، اگر مسلمان سیاسی طور پر اسی طرح بے جوڑ ٹکڑوں میں بٹے رہتے تو جیسے کہ اب ہیں، تو ایسی کوئی چیز نہیں جو ان کے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت دے سکے۔

تقسیم ہندوستان کی ریڈکلف لائن کا نقشہ

ہماری مشترکہ بصیرت اور اپنے تحفظ کے فطری شعور کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مسلم دنیا متحد ہو جائے، اور یہ صرف اسلام کی دعوت ہی ہے جو وحدت کے لیے جذباتی بنیادیں فراہم کر سکتی ہے۔ اگر ہم، پاکستانی قوم، اسلام کو اپنے سماجی اور سیاسی وجود کے لیے بنیادی عنصر بنانے کے معاملے میں انتشار کا شکار ہو جائیں، تو ہمارے درمیان اور دوسری طرف سے عربوں، افغانیوں اور ایرانیوں کے درمیان کوئی خاص قدر مشترک نہیں رہ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر ہم، اسلامی دنیا کی سب سے بڑی ریاست، ایک صحیح اسلامی نظریاتی نظام سیاست تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو پوری اسلامی دنیا کو اس مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے ایک عظیم حوصلہ مل جائے گا، اور ہم میں سے بہت سے لوگ سیاسی وحدت کا خواب جتنی مدت میں پورا ہوتا دیکھ رہے ہیں، اس سے کہیں جلدی یہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ ایسے میں قیادت یقیناً پاکستان کے ہاتھ میں ہوگی: نہ صرف اس لیے کہ ہم مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ ہمارا بطورِ ریاست قیام ہی اسلام کے لیے ہماری شعوری خواہش کا نتیجہ ہے، اور اس لیے بھی کہ ہم نے- جدید مسلم دنیا میں سے صرف اور صرف ہم نے- وہ نظریہ قائم کیا جس کی بنا پر مسلم وحدت کا حصول ممکن ہو سکتا ہے، جو کہ ہماری سیاسی فکر اور جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہے۔

فطری سی بات ہے، کوئی شخص، یہ دلیل بھی پیش کر سکتا ہے (اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے لوگ ان خطوط پر بحث کرتے بھی ہیں) کہ اسلامی نظریے پر علی الاعلان زور دینے سے غیر مسلم دنیا کا بغض بھڑک اٹھے گا اور وہ ہمارے لیے خارجہ پالیسی میں مشکلات پیدا کریں گے، جب کہ

اپنی ریاست کے "اسلامی" کردار پر زیادہ زور نہ دے کر ہم اس سے پہلو تہی کر سکتے ہیں۔ یہ دلیل، میں عرض کرتا ہوں کہ، مکمل طور پر مغالطے پر مبنی ہے۔ ہم اپنے اسلامی کردار پر زور دیں یا نہ دیں، غیر مسلم دنیا کو یہ بات واضح ہے کہ ہمارا ہدف اسلامی حکمت عملی ہی ہے؛ اس کی وجہ سادہ سی ہے، اور وہ یہ کہ دنیا اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر رہی اور نہ کر سکتی ہے کہ روزِ اول سے ہی ہم نے ایک الگ ریاست کے لیے اپنے دعوے کی بنیاد ہی اپنے مسلمان ہونے پر رکھی تھی، اور اپنے اس عزم پر کہ ہم اپنی قومی زندگی اسلامی نظریے کے مطابق تشکیل دیں گے۔ حتی کہ، اگر اپنی خارجہ پالیسی کے مفاد میں، ہم اپنے اسلامی منصوبوں اور پروگراموں کے حوالے سے ہم انتہائی دور اندیشی کے کام لینے کے خواہش مند بھی ہوں، تب بھی بیرونی دنیا کو یہ یقین رہے گا کہ ہمارا مقصد اسلام ہے ، اور وہ ہماری "دور اندیشی" کو منافقت سے زیادہ کچھ نہیں سمجھیں گے (جو کہ، ویسے، ہو گی بھی)۔ یہ بات طے ہے کہ ہم اپنے اسلامی مقاصد کے اعلانیہ اظہار کو روک کر بھی ہم مزید دوست نہیں بنا سکیں گے، اور اسی کے برابر، یہ بات بھی طے ہے کہ ہم ایسا کر کے دوسری مسلم اقوام کے ساتھ اپنی دوستی کو کمزور کر لیں گے۔ اور جہاں تک داخلہ پالیسی کا تعلق ہے، تو اس طرح اسلامی مقاصد کو دبانا خطرناک ہو سکتا ہے۔

اسلامی حکمتِ عملی کے حق میں اپنے موقف کو ہمت اور حوصلے کے ساتھ، کسی ابہام کے بغیر اعلانیہ بیان کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ پاکستان کو اس وقت جن بھاری معاشی مشکلات کا سامنا ہے۔ اور جن کا حل کسی اچھے طریقے سے نکالنا ممکن نظر نہیں آرہا۔ ان کی وجہ سے یہاں اشتراکیت کو پھیلنے کے لیے زرخیز زمین میسر آسکتی ہے۔ یہ کہ اب تک اس ملک میں اشتراکیت کی پیش قدمی جو محدود رہی ہے وہ حتمی طور پر ہمارے لوگوں کے اسلام کے ساتھ گہرے تعلق کی وجہ سے ہے، اور ان کے اس یقین کی وجہ سے کہ اگر یہاں اشتراکی نظام قائم کر دیا گیا تو قرآنِ پاک کی ہدایات کی بنیاد پر معاشرتی اور معاشی نظام قائم کرنے کی تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ اور نتیجہ یہ ہو گا کہ، اگر ہماری ریاست کو "سیکولرازم" کی طرف کھسکنے کی اجازت دے دی گئی تو ہمارے اسلامی شعور کی کمزوری کا امکان بڑھ جائے گا ، اور مارکسی پروپیگنڈے کے سامنے تمام دروازے کھل جائیں گے۔ اسی طرح، جو نظریاتی تذبذب لوگ اس وقت محسوس کر رہے ہیں، اشتراکیت کے داعی اسے پوری طرح استعمال کر رہے ہیں، اور بڑی چالاکی سے ہمارے لوگوں کے روحانی اور سماجی اضطراب کو اپنے نظریے کی خدمت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اب اشتراکیت کا، جیسے کہ ہم سب جانتے ہیں، طویل عرصے تک طاقت سے کامیاب مقابلہ نہیں کیا جا سکتا: اس کا مقابلہ صرف اس کے برابر کے یا اس سے زیادہ جاذب نظریے سے کیا جا سکتا ہے ، ایک نظریہ، جو کہ، معاشی انصاف اور مساوات کے اصولوں کو انسان کی ذاتی شناخت کی فطری خواہش اور روحانی تسکین کے ساتھ یکجا کر دے۔ ایسا نظریہ اسلام ہے، صرف اسلام، جو کہ ان تقاضوں کا جواب مہیا کر سکتا ہے۔

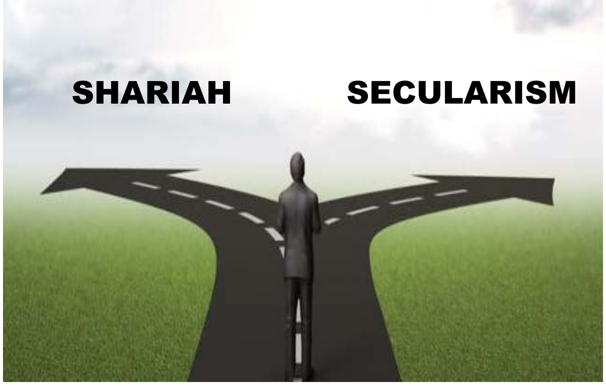

اس طرح، اسلام کو ہماری حکمت عملی کا غالب عنصر بنانے کی حمایت کے لیے بہت زیادہ مواد میسر ہے۔ اور اسلام سے میری مراد چند رسمی اور بے جان تقریبات نہیں ہے جن کی وکالت ہمارے پیشہ ور "حامیانِ اسلام" کرتے ہیں، بلکہ میری مراد زندہ، جاری نبض والا اور مکمل طور پر وقت کے تقاضوں پر پورا اترنے والا پیغام ہے جو قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی عملی مثال نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود ہے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف اس شریعت کا نفاذ نہیں ہے جو گزشتہ صدیوں کی روایتی اور زمانے سے محدود فقہ میں ہے: کیوں کہ اس کا مطلب اس جمود کو دوام بخشنا ہو گا جس کی قید مسلم فکر صدیوں سے کاٹ رہی ہے، اور طاقت اسی طبقے کے ہاتھ میں دینا ہو گا جو گزرے زمانوں میں ہماری ثقافتی پس ماندگی کے ذمہ دار تھے۔ اسلام کے بغیر ہمارا گزارا نہیں۔ البتہ وہ اپنی دائمی تروتازگی کے ساتھ اصل اسلام ہونا چاہیے، مری ہوئی بے معنی تقریبات کا ایک بوجھ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں، ہماری سیاسی فکر اور عمل کے حوالے سے اسلام کے تعارف میں اسلامی قانون کے مسئلے پر ہمارے نقطۂ نظر کی ایک تخلیقی تعبیرِ نو بھی شامل ہے۔

یہ، مختصراً، وہ پس منظر تھا جس کی بنا پر محکمۂ احیائے ملتِ اسلامیہ کا تصور پیش ہوا۔

مگر، جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا، یہ محکمہ اس وقت تک صحیح طریقے سے کام نہیں کر سکتا جب تک حکومتِ پاکستان اسلام کے معاملے میں اپنی

پالیسی واضح نہیں کر دیتی۔ اگر ہم ایک متعین نظریاتی مقصد کے بغیر گھسٹتے رہے، تو پاکستان کی وحدت ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہم اپنے سیاسی وجود کا واحد بندھن ہاتھ سے گنوا بیٹھیں گے جو جذباتی طور پر ہماری وحدت کا ضامن ہے۔ ان حالات میں حکومت کی اصل پالیسیوں سے طلاق یافتہ ایک محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ اسلامی روح کی نشاۃ ثانیہ اور ملی اخلاقیات کی ترویج کا ایک تسلسل کے ساتھ راگ الاپتا بھی رہا اس سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو گا۔

ضرورت - اور انتہائی فوری ضرورت - اس بات کی ہے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے ایک غیر مبہم بیان جاری ہو کہ ایک اسلامی نظم ریاست کا قیام، قبل تقسیم کا محض ایک نعرہ نہیں تھا اور نہ ہی انتخابات جیتنے کا آلہ کار تھا، بلکہ وہی قیام پاکستان کا اصل مقصد تھا۔ ہمیں اس معاملے میں مغربی لوگوں کی آراء سے متاثر نہیں ہونا چاہیے جو صرف ایک "سیکولر" ریاست کو ہی دور جدید سے مطابقت کی علامت سمجھتے ہیں؛ نہ ہی، یقینی طور پر، ہمیں اپنے تئیں یہ سمجھنا چاہیے کہ "پاپائیت / ملائیت" کی طرز کی ایک ریاست جسے ہمارے کوئی مولوی صاحب چلا رہے ہوں، اسلام کی حقیقی علامت ہو گی۔ یہ لوگ رجعت پسند ہیں: جب کہ اسلام مکمل طور پر ترقی پسند ہے۔ یہ لوگ مردہ فکر - قدیم، زمانے سے مقید فقہی فارمولوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں: مگر ہم نے اپنی زندگی کی تعمیر شارع کے معتبر مقاصد کے مطابق کرنی ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے، تو پاکستان بنانے میں کوئی معقولیت نہیں رہ جاتی۔

آج حکومت اپنے عوام کے دِل کی گہرائیوں کی خواہش کے بارے میں بات کرنے سے کترا رہی ہے۔ مگر ان کی نظریں حکومت پر جمی ہوئی ہیں۔ انہوں نے برطانوی بیوروکریسی کی وارث ہونے کے طور پر گزشتہ کئی مہینوں میں اسی کی طرف دیکھنا سیکھا ہے، اور ان کی اصل امیدیں مردہ ہوتی جارہی ہیں۔ ان کی خواہش نظریاتی معنویت کی حامل قیادت ملنے کی تھی، مگر انہیں وہ مل نہیں سکی۔ حکومت کے پاس اب بھی وقت ہے کہ لوگوں کو وہ کچھ دے دیں جو کچھ وہ چاہتے ہیں، اور اس طرح ان کے دِل دوبارہ اپنے قبضے میں کر لیں۔ "سوتے ہوئے کتوں کو لیٹا رہنے دو" کی پالیسی جو اب تک حکومت نے اسلامی پالیسی کے سوال پر اپنائی ہوئی ہے، زیادہ دیر کام نہیں کر سکے گی: کیوں کہ وہ سچ مچ سوئے ہوئے نہیں ہیں۔ کوئی اسے پسند کرے یا نہ کرے، اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں لوگوں کی فریادیں اور دہائیاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائیں گی، اور حکومت کی طرف سے کوئی تعمیری رہنمائی نہ ملنے پر آہستہ آہستہ انتشار کی شکل اختیار کر لیں گی۔ مایوسی کے عالم میں، عوام روز بروز تاریک سوچ کے مالک قائدین کے چنگل میں پھنستے چلے جائیں گے اور اس کے نتیجے میں ان میں قدامت پسندانہ رجحانات مضبوط ہوتے چلے جائیں گے۔ آج کل کی زندگی کے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے پیشہ ور علماءِ دین کی بالادستی (جن سے ایسے حالات میں بچنا ممکن نہیں) کا نتیجہ معاشی تعطل، سیاسی تذبذب اور پاکستان کی معاشرتی زندگی میں پست ہمتی میں اضافے کی صورت میں نکلے گا۔ ایسی بدنظمی میں جو تعطل کی مندرجہ بالا صورتوں، اس تذبذب اور اس پس ہمتی کے بعد پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے، اشتراکیت امکانی طور پر غالب آجائے گی، اور ہمارا خود مختار پاکستان تاریخی یادوں کے مراحل سے گزرے گا۔[4]

4- اقبال، بزم اقبال کا سہ ماہی مجلہ، جلد ۴۵: شمارہ: ۳، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳